ڈاکٹر نورینہ تحریم بابر
استاد شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اسلحے کی منطق سے بیزاری اور ''اُلجھی راہیں'': تحقیق و توضیح

Dr Noreena Tehrim Babar

Department of Urdu, Allama Iqbal Open University, Islamabad.

"Uljhi Rahen": A Critique

Rashid Akhter Nadvi is a popular Urdu novelist famous for his historical novels. He started as a romantic novelist but soon after his first few novels he shifted his priorities towards history. He wrote a number of novels about history of Muslims. His last novel named "Uljhi Rahen" is again a romantic novel. In this article the researcher has discussed critically that Rashid Akhter Nadvi is basically a romantic novelist and study of his novels cannot be comprehensive without discussing his romantic novels.

رشید اختر ندوی کی ناول نگاری کے معائب و محاسن کا تذکرہ ان کے آخری ناول 'اُلجھی راہیں' کے ملاحظے اور مطالعے کے بغیر نامکمل ہے۔ یہ ناول رشید اختر ندوی نے اپنے 1951ء میں شائع ہونے والے آخری رومانی ناول 'اس نے محبت کی' کے چھتیس (۳۶) برس بعد لکھنا شروع کیا۔ رشید اختر ندوی اپنی والدہ محترمہ کی مسلسل مخالفت، حوصلہ شکنی اور نصیحت کے باعث دس برس تک رومانی ناول لکھنے کے بعد، 1951ء میں 'جھوٹی کہانیاں' لکھنے سے تائب ہو گئے تھے۔ اُن کی والدہ نے جس نہج پر ان کی تعلیم و تربیت کی تھی اور جو توقعات انہوں نے اپنے اس فرزند سے وابستہ کی تھیں ان میں معاشرتی رومانی ناول لکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ رشید اختر ندوی کے ناول نگاری کے شوق اور ان کی والدہ کی طرف سے مسلسل حوصلہ شکنی ماں بیٹے کے درمیان کشمکش کی عجب داستان ہے۔ رشید اختر ندوی اپنی والدہ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ انہوں نے رشید اختر کو ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا، یہی وجہ ہے کہ محترمہ غلام فاطمہ کی رشید اختر سے توقعات بھی دُگنی تھیں۔ وہ رشید اختر ندوی کو ایک عالم دین دیکھنا چاہتی تھیں جبکہ رشید اختر ندوی، جنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور بنیاد قلم کی طاقت کو بنایا، وہ اپنے رجحان طبع اور اس دور کے ادبی ذوق اور رواج کے مطابق کہانیاں لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ کہانیاں رشید اختر ندوی کے گرد چکر لگاتی رہتی تھیں۔ لڑکپن سے وہ ہاسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے رہے، کیا دہلی، کیا لکھنو، اور پھر دہلی کی جامعہ ملیہ وہ ہاسٹل میں رہ کر پڑھے۔ ایسی زندگی کی کچھ مشکلات بھی ہوں گی لیکن شخصیت میں اعتماد اور خود انحصاری ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ 1951ء کے بعد

بالآخر انہوں نے یہ روش تبدیل کی اور اظہار ذات کی اس مسرت سے کنارہ کش ہو کر جو وہ رومانی ناول لکھنے سے حاصل کرتے تھے، انہوں نے اپنا ذوق تبدیل کیا۔ تاریخ نویسی کی طرف مائل ہوئے اور بیشہ تحقیق کی تہی دامنی کے گلے کو دور کرنے میں جُت گئے۔ پچاس کی دھائی کے آغاز سے انہوں نے اسلامی تاریخ نگاری کا آغاز کیا بعد کو یہ سلسلہ آنے والے چھتیس برس تک قائم رہا۔ ہاں مگر یہ ضرور ہوا کہ ناول نگار رشید اختر ندوی نے اسلامی تاریخ نگار محقق سے یوں سمجھوتہ کیا کہ انہوں نے تاریخی ناول نگاری شروع کر دی۔ یوں تاریخی تحقیق اور رومان نے ساتھ ساتھ جینا اور ساتھ ساتھ چلنا سیکھ لیا۔ اس دوران رشید اختر ندوی نے خوب کام کیے، قلم رواں تھا۔ تحقیق کا میدان بھی ذوق کے مطابق تھا، محنتی بھی بہت تھے۔ یہی وہ دور ہے جب رشید اختر ندوی کے وہ علمی آثار سامنے آئے جن کو حقیقتاً ان کی علمی خدمات کا عنوان قرار دیا جا سکتا ہے۔ مضطرب اور جذباتی رشید اختر ندوی کی شخصیت میں گہرے سمندر کا سکون پیدا ہو چکا تھا کہ پندرہ سیر آموں کے تحفے نے عہدِ رفتہ کو اس طور آواز دی کہ 'اُلجھی راہیں' کے زیرِ عنوان رشید اختر ندوی کا آخری ناول سامنے آ گیا۔ یہ 1987ء کا واقعہ ہے اور اس کی روداد خود رشید اختر ندوی ایک زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ ناول 'الجھی راہیں' کے حرفِ اوّل میں بیان کرتے ہیں۔

> جو لوگ میرے ناول پڑھتے رہتے ہیں انہیں اچھی طرح یاد ہو گا کہ میرا ناول 'اس نے محبت کی' 1951ء میں کتاب منزل کی طرف سے شائع ہوا تھا، اس وقت سے لے کر آج دن تک میرا کوئی اور رومانی، نفسیاتی ناول منظرِ عام پر نہیں آ سکا ہے۔ 1951ء سے لے کر 87ء تک کو 36 سال متواتر، میرے ناول پڑھنے والے، مجھ سے روٹھے روٹھے سے تھے۔
>
> ایک مہربان خاتون جنہوں نے 51ء اور 52ء میں میرا ناول 'اس نے محبت کی' پڑھ کر ازراہِ کرم مجھے سات من آم تحفتاً بھیجتے تھے۔ 52, 1951ء سے آج دن تک مجھ سے خفا ہیں کہ میں نے ناول لکھنا کیوں بند کیا ہے۔ ان کے نزدیک، میں ان کا پسندیدہ ناول نگار ہوں اور میرے سوا کسی دوسرے ناول نگار کے ناول ان کو پسند نہیں آتے۔(1)

اس پس منظر کو بیان کرنے کے بعد رشید اختر ندوی نے تازہ واردات اور اس کے نتائج کا ذکر کیا ہے۔ اس بیانیے کا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ مصنف اپنے دیرینہ شوق کو پھر سے تازہ کرنے کے تصور ہی سے کس قدر خوش اور پر جوش ہے۔ رومانی ناول نگاری کا سلسلہ تمام کرنے کی ایک بڑی واضح اور قابل فہم وجہ موجود تھی یعنی والدہ کی ناپسندیدگی کہ بالآخر جس کے سامنے رشید اختر ندوی نے رومانی نفسیاتی ناول لکھنے والا قلم بند کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ اب جبکہ وہ عمر کی پچھترویں منزل سے گزر رہے تھے اور ''.....حقیقت یہ ہے کہ میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں بھنوئیں تک سفید ہیں، میرے بالوں کی یہ سفیدی، ان تاریخی تصانیف کا صلہ ہے، جو میں نے 1951ء میں ناول نویسی ترک کرنے کے بعد 1951ء سے لے کر 1987ء تک شائع کی ہیں۔''**(2)**

رشید اختر ندوی اچانک اس طرح سے محسوس کرنے لگے تھے کہ ''جیسے مجھے ہر لمحہ یہی محسوس ہوتا رہا ہے کہ میں اس وقت بھی جبکہ 1987ء شور مچاتا گزر رہا ہے، اٹھائیس، تیس سال کا نوجوان ناول نگار ہوں، جس نے سازِ شکستہ، سوزِ دروں، ہرجائی، کانٹوں کی سیج اور تشنگی ناول لکھے۔''**(3)**

اس تجدید شوق کا باعث پندرہ سیر آم بنتے ہیں۔ 1951ء میں رشید اختر ندوی کا ناول پڑھ کر سات من آم بھیجنے والی خاتون، جو مصنف سے ناول نگاری ترک دینے کے باعث خفا تھیں، نے پھر سے اس طرف توجہ دلائی۔ 'اُلجھی راہیں' کے حرفِ اوّل میں لکھتے ہیں کہ:

انہوں نے پچھلے موسم گرما میں، مجھے پندرہ سیر آم بھیجے ہیں اور ساتھ ہی یہ شکایت نامہ بھی ارسال فرمایا ہے کہ ان سالوں میں انہیں کوئی ایسا ناول پڑھنے کو میسر نہیں آیا جو اس نے محبت کی' کا لطف تازہ کر سکتا۔(4)

اس کے ساتھ رشید اختر ندوی اس ناول کی تالیف کے ایک اور محرک کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے اور ان کی ایک اُردو کی پروفیسر سہیلی نے بعض ان پبلشروں پر سخت تنقید کی ہے جو فرضی زنانہ ناموں سے پچھلے سالوں میں برابر ناول چھاپ رہے ہیں۔ پشاور کے کچھ بڑے ادیب پچھلے سال موسم گرما میں مری تشریف لائے تھے، مری میونسپل لائبریری میں پشاوری قہوہ نوش فرماتے ہوئے انہوں نے بھی یہ نوحہ کیا تھا کہ اُردو کے بعض پبلشروں نے فرضی زنانہ ناموں سے ناول شائع کرنے کی جو روش ایجاد کی ہے، اس سے مرد ناول نگاروں کے لئے بڑی مشکلات پیش آ گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں پھر سے ناول لکھنا شروع کر دوں تا کہ ان ظالم پبلشروں کی یہ روش کسی قدر مجروح ہو جائے اور نئے مرد ناول نگاروں کی راہ ہموار ہو جائے۔ یہ ان کا حسنِ ظن تھا کہ انہوں نے مجھ پر اس درجہ اعتماد کیا اور مجھے یہ حیثیت عطا کی، بہر حال میں ان خاتون قبل الذکر اور ان کی پروفیسر سہیلی کا بہت بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ۳۶ سال کے طویل وقفے کے بعد ناول نویسی پر متوجہ کیا ہے اور میرے ناول کے محرک بنے ہیں۔''**(5)**

ناول کے حرف اوّل کا کثیر حصہ ناول لکھنے کے ایک سے زیادہ جواز رقم کرنے پر صرف ہوا ہے یعنی اوّل خواتین کی طرف سے رشید اختر ندوی کے ناولوں کی پسندیدگی، دوم خواتین کے فرضی ناموں سے شائع ہونے والے ناولوں کا فروغ اور مرد ناول نگاروں کی حوصلہ شکنی اور سوم خواتین اور کچھ بڑے ادیبوں کی طرف سے مرد ناول نگاروں کی راہ از سرِ نو ہموار کرنے کے لئے رشید اختر ندوی سے اس میدان میں واپس آنے کی خواہش کا اظہار۔ یہ سارے جواز اپنی جگہ جزوی طور پر درست نہ بھی ہوں تب بھی رشید اختر ندوی کے لئے ناول نویسی کو ذوق و شوق کے تازہ کرنے کا حق محفوظ تھا۔ انہوں نے خواتین میں اپنے ناولوں کی پسندیدگی کا ذکر کیا ہے۔ یہ تاثر امر واقعہ ہو سکتا ہے، بیسویں صدی میں چالیس اور پچاس کی دھائی کی مجموعی صورت حال کو سامنے رکھیں اور پڑھے لکھے طبقے کے لئے دستیاب مواقع قیاس کریں، تو کھلتا ہے کہ اس دور میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق ناول پڑھنے کا رواج عروج پر تھا۔ نوجوانوں میں اور پڑھی لکھی خواتین میں ہر طرح کے رومانی ناول مقبولیت حاصل کر لیتے تھے۔ رومانی ناولوں کی اس قبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ رشید اختر ندوی کا پہلا ناول 'سازِ شکستہ' جو 1942ء میں گیارہ سو کی تعداد میں شائع ہوا، 1943ء میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوتا ہے، پھر 1944ء میں تیسرا، 1945ء میں چوتھا، 1948ء میں پانچواں، 1949ء میں چھٹا، 1951ء میں ساتواں، 1952ء میں آٹھواں اور 1954ء میں نواں ایڈیشن اس ناول کا شائع ہوتا ہے اور ہر ایڈیشن گیارہ صد کی تعداد میں۔ اگر اشاعت کے اس سلسلے کا عصر حاضر کی صورت حال سے موازنہ کیا جائے تو عمومی طور پر ایک کتاب کے پانچ صد نسخے آنے والے پندرہ سالوں میں بھی مکمل طور پر فروخت نہیں ہو پاتے۔ تو ہر طرح کے ناول کی مقبولیت میں تو کوئی کلام نہیں، ہاں مگر یہ جو پبلشرز کی طرف سے خواتین کے فرضی ناموں سے

ناولوں کی اشاعت کا معاملہ اور مرد ناول نگاروں کی حوصلہ شکنی کا قصہ ہے اسے من وعن تسلیم کرنے میں تامل کی متعدد وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ 1951ء سے 1978ء کے دوران شاید کوئی ایک آدھ واقعہ ایسا ہو جہاں کسی پبلشر نے کسی خاتون کے فرضی نام سے کوئی ناول شائع کر دیا ہو اور وہ پڑھا بھی گیا ہو لیکن یہی وہ دور ہے جب اُردو زبان کو بہترین ناول نگار خواتین میسّر آئیں۔ سب سے نمایاں اور قابلِ ذکر نام تو قرۃ العین حیدر کا ہے۔ ان کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' 1948ء میں شائع ہوا، چلئے اسے شمار نہ بھی کریں تو 'سفینۂ غم دل' جو 1952ء کو چھپا، سے لے کر ''گردش رنگ چمن'' تک مقبول اور محبوب ناولوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ناول نگاری کے عہد کو خواتین ناول نگاروں کے حوالے سے قرۃ العین حیدر کا عہد بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر دیگر ناول نگار خواتین بھی اسی دور میں نمایاں ہوئیں۔ خدیجہ مستور، الطاف فاطمہ، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، حجاب امتیاز علی، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی، نثار عزیز بٹ، سائرہ ہاشمی اور پھر بانو قدسیہ خواتین ناول نگاروں میں سے یہ چند نام ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی فرضی نام نہیں، اور سب کی سب اپنی اپنی جگہ نہایت مقبول ناول نویس خیال کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض خاتون ناول نگاروں نے تو رجحان ساز ناول بھی تخلیق کئے۔ ایسے میں رشید اختر ندوی کا یہ تاثر درست معلوم نہیں ہوتا کہ اس دور میں خواتین کے فرضی ناموں سے شائع ہونے والے ناولوں کو فروغ ملا۔ ہاں مگر، اگر اس سے مراد ہے کہ اس دور میں خواتین ناول نگاروں کی تخلیقات کو فروغ ملا تو یہ بات درست ہے۔ اس طرح رشید اختر ندوی کی طرف سے اس تاثر کا اظہار کہ اس دور میں مرد ناول نگاروں کی حوصلہ شکنی کی گئی محلِ نظر معلوم ہوتا ہے۔ جس دور میں عزیز احمد، انتظار حسین، احسن فاروقی، عبداللہ حسین، شوکت صدیقی، غلام الثقلین نقوی، خواجہ احمد عباس، ممتاز مفتی جیسے تخلیق کار ناول لکھنے میں معروف ہوں اور ان کے ناول شائع ہو کر وسیع ترین حلقوں میں مقبولیت بھی حاصل کر رہے ہوں وہاں یہ قیاس کر لینا کہ مرد ناول نگاروں کی حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے، درست معلوم نہیں ہوتا۔ دراصل رشید اختر ندوی اگر اپنے تئیں مرد ناول نگاروں کیلئے رستہ ہموار کرنے کی خاطر دوبارہ سے ناول لکھنے کو جواز نہ بھی بناتے تو ان کے از سرِ نو ناول لکھنے پر کسی کو بھی اعتراض نہ ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طویل عرصے تک تاریخ نویسی کے بعد دوبارہ رومانی ناول لکھنے کے ہچکچاہٹ کو، شعوری طور پر دور کرنے کے لئے، کچھ جواز فراہم کر رہے تھے حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ ان محرکات کا ذکرِ جمیل کرنے کے بعد اس آخری ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> اس ناول کی اچھائی برائی تو اس کے صفحۂ اوّل سے لے کر صفحۂ آخر تک کی داستان ہے اور میں نے کبھی اپنے بارے میں اس تعلّی کو نہیں برتا ہے جو میرؔ و غالبؔ و سوداؔ کی خصوصیت تھی۔ تاہم میں یہ کہنے میں ہرگز ہرگز تامل نہیں کروں گا کہ میرے اس ناول میں میری جوانی کی روانی بھی شامل ہے اور میرے بڑھاپے کی پرکھ اور احتیاط بھی۔(6)

غرض عمرِ عزیز کے آخری عہد میں جب انہوں نے اپنا سب سے ضخیم ناول لکھ کر اپنے عہد شباب کی ہنگامہ خیز رومانی ناول نگاری کی یاد اور تجربے کو تازہ کیا تو ان کی آنکھوں میں تیز ترین چمک اور ہونٹوں پر شیرینی کے احساس کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔**(7)** رشید اختر ندوی نے دل کی تیز دھڑکنوں کی آواز کے شور میں یہ ناول لکھنا شروع کیا اور ناول کا پلاٹ، کردار، مکالمے، مناظر، فلسفہ حیات سب کچھ اُن کے عہد شباب کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ انہیں المیہ کہانی پسند ہے۔ انہیں طبعاً ساز شکستہ کی آواز اچھی لگتی ہے۔ بطور ناول نگار رشید اختر ندوی کے طرز احساس کی کلید لفظ ''تشنگی'' ہے۔ خود ناول 'تشنگی' کا ہیرو محسن بھی اپنے

تمام تر اوصاف کے باوجود مارا جاتا ہے۔ ناول 'نشیمن' کا انجام محبت کی تکون کی بیک وقت وفات ہے۔ خود 'اُلجھی راہیں' جس طرف اشارہ کرتی ہیں اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار کے بڑھاپے کی پرکھ اور احتیاط بھی اس طرزِ احساس کو تبدیل نہ کر سکی اور جملہ کردار شدید کشمکش کا شکار رہنے کے بعد بالآخر نہایت المناک انجام سے دوچار ہوتے ہیں، اور زندگی اور زندگی کی راہیں، بدستور اُلجھی رہتی ہیں۔ 'اُلجھی راہیں' رشید اختر ندوی کی رومانی، نفسیاتی ناول نگاری کا نمائندہ ناول خیال تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں وہ تمام عناصر بدستور موجود ہیں جنہوں نے 1941ء سے لے کر 1951ء تک مصنف کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

جس دور میں رشید اختر ندوی نے 'اُلجھی راہیں' لکھنا شروع کیا وہ دور عمر کا نہایت پختہ دور کہا جا سکتا ہے۔ رشید اختر ندوی کی علمی و ادبی خدمات میں علمی خدمات کا تفوق نہایت نمایاں صورت اختیار کر چکا تھا۔ وہ ایک مؤرخ، ایک روشن خیال مذہبی دانش ور اور شبلی کی طرح اسلامی تاریخ کے ماہر کی شہرت پا چکے تھے۔ ان کی رومانی اور تاریخی ناول نگاری اس سفر میں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اگرچہ اپنے مخصوص سیاسی تصورات اور اسلام کی روشن خیالی اور انقلابی تعبیر کے باعث وہ ان تمام علمی و ادبی طبقات میں بہت زیادہ قابل قبول نہیں رہے تھے جنہوں نے 1977ء کے مارشل لاء کے بعد آنے والے دس گیارہ سال تک اپنا تسلط ملک عزیز کی ذہنی زندگی پر قائم رکھا۔ تقدیر پرستی کو متاع عزیز بنانے والے تصوف پر مبنی ادب، اسلامی تعلیمات اور ان کے مخصوص اثرات کو پھیلانے والے مذہبی دانشور اور تحریک پاکستان کی سیاسی و سماجی سطح پر مسلسل مخالفت کرنے والی مذہبی سیاسی جماعتوں کے اکابرین کی مرضی و منشاء ملک کی اجتماعی زندگی پر چھائی رہی۔ یہ دور رشید اختر ندوی نے زیادہ تر مری میں گزارا، اسلام آباد میں بھی ان کا گھر تھا لیکن قیام وہ زیادہ مری میں کرتے۔ اس دور میں اگر رشید اختر ندوی کے علمی و ادبی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو وہ اپنا اساسی کام کر چکے تھے۔ ایک ادیب کے طور پر ان کا مرتبہ متعین ہو چکا تھا تو ایسے میں جب وہ دوبارہ ایک چھتیس سال پرانے 'شغل' کو ایک ناقابل بیان اندرونی مسرت سے لبریز احساس کے ساتھ تازہ کرتے ہیں تو کھلتا ہے کہ ایک دباؤ کے تحت ناول نویسی ترک کرنے کے بعد اور طویل مدت تاریخ و تحقیق کی دنیا میں گزارنے کے باوجود وہ اٹھائیس، تیس سال عمر کے ناول نگار کو ختم نہیں کر پائے تھے۔ وہ زندہ رہا اور موقع ملتے ہی سامنے آ گیا۔ 'اُلجھی راہیں' کا حرفِ اوّل ہمیں اس تجربے میں شامل کرتا ہے:

> ..... مجھے فخر ہے کہ میں نے آنکھ بند کرنے سے پہلے، اپنے اس شغل کی تجدید کر کے بڑا اچھا کام کیا ہے جس سے میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا اور جس سے مجھے بڑا فیض پہنچا ہے، میں نے عزت و شہرت پائی اور مالی منفعت بھی حاصل کی۔ اگر میں نے ناول نویسی نہ کی ہوتی تو میں اس وقت وہ نہ ہوتا جو ہوں۔ میری طرف سے میرا یہ ناول میری جوانی کے دور کی ناول نویسی کے حضور خراج ہے۔(8)

یہ ناول 'اُلجھی راہیں' رشید اختر ندوی کے سترہ رومانی، نفسیاتی ناولوں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ اس ناول کا پلاٹ اس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ ناول کی اساس یعنی پیہم کشمکش اور مسلسل پیکار تھمنے نہ پائے، کہانی کا پہلو نہایت تیز اور کسی قدر 'منہ زور' ہے۔ 'منہ زور' سے مراد یہ کہ بعض مقامات پر کرداروں کا ردِعمل خود مصنف کے قابو سے باہر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دراصل ایسا ہوتا نہیں ہے۔ کرداروں کے مابین مسلسل الجھاؤ، ٹکراؤ اور متعدد مقامات پر تصفیہ کی شرم ناک شرائط قصے کے مجموعی

مزاج کے عین مطابق معلوم ہوتی ہیں۔'اُلجھی راہیں' کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں ذرا اس ذہنی اور فکری فضا کا جائزہ بھی لینا چاہیے جس سے رشید اختر ندوی گزرے۔ رومانی ناول نویسی کے دورِ اوّل کا تعلق قیامِ پاکستان سے قبل اور فوری بعد کا ہے۔ بیسویں صدی کی پانچویں دھائی کے بعد پاکستان جس طرح کے سیاسی، سماجی، عسکری اور ثقافتی الجھاؤ کا شکار رہا اس نے اجتماعی دانش کو مبتلا اذیت تو کیا ہی، نقصان بھی پہنچایا۔ سیاست کا اثر معاشرت اور معاش پر پڑتا ہے اور معاشرت اور معاش افراد کے اخلاقی روّیوں کا تعین کرتے ہیں یا اثر انداز ہوتے ہیں۔ طویل عسکری مداخلت نے ایک خاص طرزِ فکر و عمل کی حوصلہ افزائی کی، اور ریاست پاکستان میں فرد اور ریاست کے رشتے میں ریاست کو مقدم اور فرد کو مؤخر کر دیا گیا۔ یہ بات عمرانی اصول کے خلاف ہے۔ ریاست افراد کی حفاظت، بقا اور فلاح کے لئے ہوتی ہے۔ از خود ریاست کا وجود مجرد معنوں میں مقصود نہیں بن سکتا۔ عسکری مداخلت نے لوگوں کے رویئے بھی متاثر کئے اور غور و فکر کے جملہ سرچشمے دباؤ اور تناؤ کا شکار ہو چکے۔ یہ ہمہ جہت ذہنی دباؤ اور انتشار اس ناول کا مرکزی خیال معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ناول کے قصے کا منظر اور ماحول دوسری جنگ عظیم کے بعد کے برٹش انڈیا کا ہے لیکن پلاٹ کے زمان و مکان کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ناول نگار نے خود اپنے عہد یعنی بیسویں صدی کی آٹھویں دھائی کے ہمہ جہت خلشفار کو آشکارہ کرنے کی سعی کی ہے۔ ناول کے جملہ کرداروں کا طرزِ عمل اس عہد کے اجتماعی المیے کا علامتی اظہار قیاس کیا جا سکتا ہے۔

رشید اختر ندوی کا مری میں ایک مکان تھا، جہاں وہ موسم گرما کے چند مہینے گزارا کرتے تھے۔ پچاس کی دھائی کے اواخر میں وہ مکان آرمی کے ایک میجر کو کرایہ پر دے دیا گیا۔ 1958ء کے مارشل لاء کے بعد کرایہ دار میجر ارشاد احمد خان لودھی نے مکان پر مستقلاً قبضہ کرنے کی کوشش کی گویا اس نے ملک اور مکان کو ایک ہی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی۔ سامنے رشید اختر ندوی تھے، مزاحمت ہوئی، بات نہ بنی تو مارشل لاء کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ رشید اختر ندوی نے نہایت مستعد پیروی کی اور مقدمہ جیت لیا۔ میجر لودھی کو مکان خالی کرنا پڑا اور مبینہ طور پر کورٹ مارشل بھی ہوا۔**(9)**

رشید اختر ندوی کے لئے اگرچہ حصول حق کے لئے عدالت جانا اور پیروی کرنا نیا تجربہ ہرگز نہیں تھا لیکن میجر لودھی کے طرزِ عمل نے انہیں بطور خاص خفا کیا۔ اس خفگی کا برملا اظہار 'اُلجھی راہیں' کے مثالی منفی کردار جنید مرزا کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جنید مرزا یوں تو میجر نہیں بلکہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کا مسلمان اسسٹنٹ ہے لیکن اُس کے اندر چھپی نفرت، حد سے بڑھے ہوئے حسد کے جذبے، ضد اور ہٹ دھرمی اور ہمہ وقت سازش میں مشغول رہنے کی روش نے اسے میجر ارشاد احمد خان لودھی کے کردار سے بڑا قریب کر دیا ہے۔

اس ناول کے مرکزی اور متحرک کردار چھ ہیں، ان میں تین مرد اور تین خواتین ہیں۔ مرد کرداروں میں سہیل مرزا برطانوی فوج میں کپتان ہے۔ اس کا بھائی انوار مرزا بھی برطانوی فوج میں کپتان کے عہدے پر فائز ہے۔ دونوں بھائی دوسری جنگِ عظیم میں حصہ لیتے ہیں۔ انوار مرزا جنگ میں کام آتا ہے جبکہ سہیل مرزا زخمی ہو کر واپس آجاتا ہے۔ سہیل مرزا ایک کامیاب اور ماہر فوجی افسر ثابت ہوتا ہے۔ وہ بریگیڈیئر کے عہدے تک پہنچتا ہے۔ اس کے مفاخر کی اطلاع اس کا یہ مکالمہ دیتا ہے کہ ''محاذِ جنگ پر، میرے نشانے کی بڑی دھوم تھی، میں نے ایک ماہر نشانچی کی حیثیت سے تین میجر جنرلوں، دو بریگیڈیئروں اور سترہ کرنلوں کو ہلاکت عطا کی۔''**(10)**

دوسرا اہم کردار جنید مرزا کا ہے۔ یہ سہیل مرزا کا ماموں زاد ہے۔ اس کی ایک بہن آسیہ نامی ہے۔ آسیہ اس ناول کے بنیادی تنازعہ کا عنوان ہے۔ جنید مرزا نے بھی برطانوی فوج میں کمیشن حاصل کیا اور سیکنڈ لیفٹیننٹ سے آگے ترقی نہ کر سکا۔ جنید مرزا اس عہد کی تمام تر برائیاں اپنے کردار میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس نے اپنی زندگی حسد، انتقام اور فساد کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اسی کردار میں خیر اور نیکی کا کوئی ایک پہلو بھی دریافت نہیں ہو سکا، یوں فنی طور پر یہ ایک جامد کردار ہے۔ یہ جس قدر بُرا شروع میں ہے ناول کے آخر تک وہ اسی قدر بُرا رہتا ہے۔ لوگوں کی زندگیوں کو الجھانا، برباد کرنا، اور گولیوں سے بھون ڈالنا اس کے من پسند مشاغل ہیں۔

اسلحہ اور اس کا بے محابہ استعمال اس ناول کے پلاٹ کا ایک اہم جزو ہے۔ ناول کے جملہ کردار فوج سے متعلق ہیں۔ دوسری جنگ عظیم لڑ چکے ہیں۔ ناول کا معروف معنوں میں ولن بھی فوج سے وابستہ رہ چکا ہے لہٰذا اسلحہ از قسم پستول (گیارہ گولیوں والا؟) اسٹین گن اور تیز دھار والے خنجر اس ناول کے کرداروں کے پاس بہ مقدار وافر موجود ہیں۔ اسی ناول کے کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے جملہ حوادث کا فیصلہ بحث، دلیل اور منطق کی بجائے گولی سے ہوتا ہے۔ کیا یہ 'اُلجھی راہوں' والے جنگل کا کوئی بہت بڑا استعارہ تو نہیں؟

ناول کا تیسرا مرد کردار نواب زادہ محمد خان بلوچ ہے۔ سہیل مرزا کی طرح برطانوی فوج میں افسر رہا، دوسری جنگ عظیم میں محاذِ جنگ پر دادِ شجاعت دیتے ہوئے زخمی ہو کر اور ایک پاؤں گنوا کر انگریز نرس کے ساتھ واپس لوٹتا ہے۔ یہ ایک مجہول کردار ہے۔ بریگیڈیئر بلوچ ایک جذباتی، احمق اور بے عمل کردار ہے۔ اس کی زندگی کے جملہ واقعات و حوادث اُس پر وارد ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ پورے ناول میں نظر نہیں آتا جس کے وقوع کا باعث خود بریگیڈیئر بلوچ بنے ہوں۔ وہ اپنے قریب رہنے والی اور محبت کرنے والی ناہید بیگم کی وابستگی کو پہچان نہ پائے۔ ان کے نزدیک بیک وقت دو خواتین ڈاکٹر شمیم سلطان اور ناہید بیگم ایسی تھیں جو بلوچ سے محبت کرتی تھیں لیکن بلوچ اپنی انگریز نرس مارگریٹ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اس سے شادی کر لی۔ تا آنکہ بریگیڈیئر بلوچ کے گھر پناہ لینے والے دوست سہیل مرزا نے پہلے اپنی معالج شمیم سلطان اور پھر ناہید بیگم سے شادی کر لی۔

ناول کے نسوانی کردار بڑے متنوع ہیں۔ ان کرداروں کا طرزِ عمل، اخلاقیات اور سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے سلیقے اُس طبقے کی اخلاقیات کی غمازی کرتے ہیں۔

ایک آسیہ بیگم ہیں جنید مرزا کی بہن۔ سہیل مرزا سے محبت کرتی ہے۔ جنید مرزا اس تعلق کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اس کی شادی سہیل مرزا کے بڑے بھائی انوار مرزا سے کروا دیتا ہے۔ انوار مرزا دوسری جنگِ عظیم میں جاں بحق ہو جاتا ہے تو سہیل مرزا چپکے سے آسیہ سے شادی کر لیتا ہے۔ جنید مرزا اس شادی کو تسلیم نہیں کرتا اور اس شادی کے گواہ کی زبان کاٹ دیتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس ناول میں اعضاء کاٹنے کے ایک سے زیادہ منظر نظر آجاتے ہیں۔ یہ حد درجہ ذہنی خلفشار کی طرف سے اشارہ ہے، جو بے رحم سفاکی کو جنم دیتا ہے۔ جنید مرزا کے ہاتھوں سمندر خان (ملازم) کی زبان کاٹنے کا منظر ہو یا سہیل مرزا کے طرف سے جنید مرزا کی ناک کاٹنے کا منظر یہ سب اس اندرونی سفاکی، بے رحمی اور عقل و خرد سے بے گانگی کی علامتیں ہیں، جو اس ناول کے کرداروں کی وساطت سے اُس عہد کے بارے میں سامنے آتی ہیں۔

جنید مرزا اپنی بہن آسیہ کو یہ بتا کر کہ اس کا شوہر سہیل مرزا جنگ میں مارا جا چکا ہے، اس کی تیسری شادی ایک کروڑ پتی پیرزادے کے ساتھ کر دیتا ہے۔ آسیہ بیگم کا کردار، رشید اختر ندوی کی کردار نگاری، تصور عورت اور مکالمہ نگاری کے انداز اور سطح کو عیاں کر دیتا ہے۔ ایک منظر میں سہیل مرزا جنید مرزا کی سازش کا شکار ہو کر آسیہ بیگم کے تیسرے شوہر کے گھر پر نواب مہابت اور ناہید بیگم کے ساتھ موجود ہے۔ آسیہ بیگم کے ساتھ مئے نوشی میں مشغول سیاہ حبشی کے خنجر سے نواب مہابت خان بُری طرح زخمی ہو جاتے ہیں۔ ناہید بیگم کے متوجہ کرنے پر سہیل مرزا جو فائرنگ کے تبادلے میں معروف ہوتا ہے، سب کچھ چھوڑ کر نواب مہابت خان کو اُٹھا کر گاڑی میں ڈالتا ہے اور ناہید بیگم کے ساتھ روانہ ہونا ہی چاہتا ہے کہ سامنے سے پولیس کی جیپ راستہ روک لیتی ہے جبکہ پیچھے سے آسیہ بیگم کی ''شرابی آواز تند و تیز بارش کی طرح فضا پر چھا جاتی ہے۔''(11) اب ملاحظہ فرمائیے آسیہ بیگم کا ایک طویل مکالمہ اطراف میں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے، سہیل مرزا ایک زخمی بوڑھے نواب کو اسٹین گن بردار ناہید بیگم کے ہمراہ گاڑی میں ڈال کر لے جانا چاہتے ہیں۔ اس ہنگامے میں آسیہ بیگم جو نواب مہابت خان کو خنجر مارنے والے سیاہ فام کے ساتھ نہایت محویت کے عالم میں شراب نوشی میں مشغول تھی۔ اب سہیل مرزا کو زندہ سلامت دیکھ کر چلا کر وضاحت کر رہی ہے۔

> میں بہت شرمسار ہوں سہیل، جنید نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم لڑائی میں مارے گئے ہو، اس نے میرے اور تمہارے بچے کو مار کر مجھے زبردستی اس کروڑ پتی پیرزادہ سے بیاہ دیا جو اس گھر کا بے حس مالک ہے جہاں یہ ڈرامہ کھیلا گیا ہے اور یہ تم نے جس شخص پر گولیاں چلائی ہیں یہ میرا شوہر نہیں تھا۔ یہ میرے بھائی جنید کا معتمد ساتھی اور بمبئی میں اس کا نمائندہ تھا۔ یہ تھوڑی دیر پہلے جنید کا بھیجا ہوا میرے پاس آیا تھا اور تم نے جو تماشا دیکھا یہ محض ناٹک تھا جو اس ذلیل نے رچایا تھا اور میں اب سمجھی ہوں کہ میرے بدبخت اور کمینے بھائی نے یہ ناٹک کیوں رچوایا۔ مجھے معاف کر دو سہیل، مجھے معاف کر دو، میں شرابی تو ضرور ہوں مگر میں اس جرم میں بالکل شریک نہیں ہوں، یہ میں نے تمہاری بیوی کے بزرگ بابا پر حملہ نہیں کرایا ہے، یہ سب میری لاعلمی میں ہوا ہے اور جنید کے کارندے نے میرے شرابی ہونے سے غلط فائدہ اُٹھایا ہے اور میں شراب اپنے شوق سے نہیں پیتی، شراب میری مجبوری ہے کہ میں جو زندگی گزار رہی ہوں وہ آسودگی کی نہیں، مجبوری کی زندگی ہے۔(12)

کہانی کے اس قدر ہنگامہ خیز، جذباتی اور خطرناک موڑ پر اس قدر مفصل وضاحت کی ضرورت تھی اور کیا ایسی صورتِ حال میں اس قدر طویل مکالمے کا امکان ہوتا؟ مصنف کو اس سے کوئی سروکار نہیں، یہاں مصنف آسیہ بیگم کی طرف سے نہ صرف سہیل مرزا کو بلکہ عام قاری کو بھی ایک تفصیلی وضاحت پیش کر رہا ہے۔ چلئے آسیہ بیگم کے کردار کے ایک اور رُخ کو دیکھتے ہیں۔ پولیس والے سہیل مرزا کی گاڑی کو روک کر پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اب آسیہ بیگم پولیس افسر کو کس طرح اس ارادے سے باز رکھتی ہے:

> آسیہ بیگم نے..... پولیس افسر کا ہاتھ اپنے نازک حنائی ہاتھ میں لے کر نغمہ کی سی مٹھاس اپنی زبان میں بھر لی۔ چوکیدار بالکل اجڈ پٹھان ہے یہ تو میں بریگیڈیئر سہیل مرزا کو اچانک اپنے ہاں مہمان پا کر آتش بازی چھوڑ رہی تھی اور یہ بدبخت نہ جانے کیا کچھ سمجھ بیٹھا۔ یہ کہتے کہتے آسیہ بیگم نے اپنے خوبصورت سر کو کئی جھٹکے دیئے، اس کے سنہری گھنگریالے بال اس کے چہرے پر لہرا گئے۔ اس نے رُکی ہوئی موٹر پر ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی،

پولیس افسر کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں رکھے رکھے بہت زور سے دبایا اور سہیل مرزا کو حکم دیا کہ گاڑی تیزی سے بڑھالو سہیل مرزا.....(13)

سہیل مرزا زخمی مہابت خان اور ناہید بیگم کے ساتھ نکل گیا پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ پولیس افسر کے ساتھ آئے سپاہیوں نے ایک نگاہ آگے کو جاتی گاڑی اور دوسری نظر:

صحن چمن میں سے پولیس افسر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے آگے کو بڑھتی آسیہ بیگم پر اچھالی۔ ان کی نگاہ کے سامنے آسیہ بیگم اور پولیس افسر نے برآمدہ میں قدم رکھے اور پھر اندر کو بڑھ گئے.....مگر جب ان کا افسر کئی گھنٹے دبیز پردوں میں گزار کر باہر آیا تو حالانکہ اس کے پاؤں بُری طرح لڑکھڑا رہے تھے اور جسم شراب کے نشے میں ڈول رہا تھا مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی حوصلہ نہیں ہوا کہ وہ اس سے پوچھیں کہ وہ خوبرو مجرم آپ کے ساتھ کیوں نہیں ہے.....(14)

یہاں جنید مرزا کی بہن، سہیل مرزا کی پہلی محبت اور پہلی بیوی، ایک مظلوم عورت کی بجائے ایک زمانہ ساز طوائف کے روپ میں نظر آتی ہے۔ یہ رشید اختر ندوی کی کردار نگاری کا خاص انداز ہے۔ اگر چہ وہ جس طبقے کی تصویر کشی کر رہے ہیں اس کی اخلاقیات معروف و مروّج اخلاقیات سے جدا ہوتی ہیں لیکن ایک شریف زادی کا اس انداز میں پولیس افسر کو رام کرنا، اس کے کردار کی کسی خوبی کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ رشید اختر ندوی نے جس طرح کے نسوانی کردار اس ناول میں پیش کئے ہیں وہ کم و بیش اسی طرح کے ہیں۔ یہ مختلف عورتیں ہیں، ناول میں جس قدر پیچیدگیاں، الجھنیں اور حادثے رونما ہوتے رہیں، یہ عورتیں فوراً شادی کرنا نہیں بھولتیں۔ آسیہ بیگم کثرت شراب نوشی کی بھی شوقین ہیں اور جب بھی بات کرتی ہیں تو طویل طویل مکالمے اس کی زبان سے رواں ہوتے ہیں۔ ایک اور نسوانی کردار ڈاکٹر شمیم سلطان کا ہے، ڈاکٹر صاحبہ نواب مہابت کے والد کے ذاتی محافظ سلطان احمد کی بیٹی ہے۔ بچپن نواز بلوچ جو بعد میں بریگیڈیئر بلوچ کہلائے، کے ساتھ گزرا ہے۔ بلوچ سے محبت کرتی ہے لیکن اپنی سہیلی اور بلوچ کی عزیزہ ناہید بیگم کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کر پاتی کہ ناہید بیگم بھی بلوچ کی محبت میں اسیر ہے لیکن بلوچ کے لئے اس ناول میں ''مٹی کا مادھو'' کا خطاب اس تواتر سے آیا ہے کہ یہ اُس کے مجموعی کردار کی تجسیم بن کر رہ گیا ہے۔

شمیم سلطان سہیل مرزا سے شادی کرتی ہے۔ پھر جنید مرزا کے دھمکانے اور ڈرانے پر اس سے طلاق لے کر جنید مرزا سے شادی کر لیتی ہے۔ اس ناول میں صرف ناہید بیگم کی ایک ہی شادی ہو پائی ہے لیکن وہ سہیل مرزا کے ساتھ، جن کی یہ بالترتیب تیسری بیوی بنتی ہیں۔ ناول جنید مرزا کی نفرت، حسد اور انتقام کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔ ناول کا افسوس ناک انجام پڑھ کر رشید اختر ندوی کے دورِ شباب کے ناول 'نشیمن' کا انجام یاد آجاتا ہے جس میں محبت کی تکون یعنی ہیرو اور باری باری دو خواستگار خواتین ایک ہی منظر میں جان سے چلی جاتی ہیں۔

شہزادی نامی ہیروئن مر رہی ہے کہ نہایت خستہ اور زخمی حالت میں ہیرو عدنان داخل ہوتا ہے، اسے شہزادی کے ساتھ صوفے پر ڈال دیا جاتا ہے۔ یہاں ہیرو، ہیروئن دونوں جان دے دیتے ہیں کہ اچانک نوشابہ یہ منظر نہ دیکھ سکی اس کا کمزور دل ڈوب گیا وہ وہیں دھڑام سے گر پڑی اور پھر اُٹھ نہ سکی۔**(15)**

چھتیس سال بعد بھی ناول نگار کے پاس کہانی کی اُلجھی ہوئی ڈور سلجھانے کے لئے کرداروں کی عبرت ناک موت کے سوا

کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں۔ 'اُلجھی راہیں' کا انجام بھی کچھ اس سے زیادہ اُلجھی ہوئی المناکی سے ہوتا ہے۔ جنید مرزا کے انتقام مسلسل کا ایک اور شاخسانہ ماں کے ہاتھوں نادان بیٹے کی ہلاکت اور پھر ماں کے دل دہلا دینے والے بین۔ ناول کے آخری صفحات گولیوں کی تڑتڑ کے شور میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ شور دراصل اس امر کا علامتی اعلان ہے کہ ناول نگار حیات و کائنات کے بارے میں کسی واضح، ارفع اور قائل و مطمئن کرنے والے تصور کے نظم سے بے خبر ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے موقع پر انسان نے جو تباہی اور انسانیت کی جو تذلیل دیکھی، اس تباہی اور اس کے ہمہ گیر اثرات نے بے چارگی، بے توقیری، عدم برداشت، خودغرضی اور زیرِ دست کے لئے زبردست انتقام کے چلن کو عام کیا۔ یہ ناول ان جملہ کیفیات کا ایک ضخیم اظہار ہے۔ عمدہ زبان و بیان، ادبی چاشنی اور متاثر کن اسلوب سے عاری یہ ناول زندگی کو لایعنی اور بے حاصل ثابت کرنے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔

حواشی/حوالے:

1- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی (لاہور: نذیر سنز پبلشرز، 1990ء)، ص3
2- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص4، 5
3- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص5
4- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص3
5- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص3، 4
6- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص4
7- رشید اختر ندوی، رومان، تاریخ اور تحقیق، شاہد اقبال کامران، نورینہ تحریم بابر، ص546
8- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص5
9- میجر ارشاد احمد خان لودھی کے کورٹ مارشل کی روایت تو ہے لیکن چونکہ کوئی دستاویزی شہادت میسّر نہیں آئی اس لئے اس روایت کا ذکر 'مبینہ طور پر' کی احتیاط کے ساتھ کیا گیا ہے۔
10- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص12
11- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص291
12- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص291، 292
13- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص294
14- اُلجھی راہیں، رشید اختر ندوی، ص294، 295
15- نشیمن، رشید اختر ندوی، ص270